انشؔا اور ان کی غزل کے تیور

ڈاکٹر احمد امتیاز

شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف دہلی، موبائل: 9899754685

انشاء اللہ خاں انشؔاء (۱۷۵۶ء–۱۸۱۸ء) کے آباواجداد دلّی کے رہنے والے تھے، لیکن خود انشؔاء کی پیدائش مرشد آباد میں ہوئی۔ انشؔاء کے والد میر ماشاء اللہ، نواب شجاع الدولہ کے ملازم تھے۔ شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد وہ انشؔاء کے ساتھ دلّی چلے آئے۔ سولہ برس کی عمر میں انھیں شجاع الدولہ کے دربار میں باریابی حاصل ہوئی۔ اس لیے دلّی آنے کے بعد شاہ عالم ثانی کے دربار میں بھی باریابی پائی اور دلّی کی مختلف شعری محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔ اس زمانے میں شجاع الدولہ کے بیٹے امین الدولہ عرف میڈھو دلّی میں ہی مقیم تھے اور ان کے یہاں اکثر محفلِ مشاعرہ منعقد ہوتی تھی اور انشؔاء اُن میں شامل ہوتے تھے۔ انشؔاء بے حد ذہین تھے، حافظہ بھی قوی تھا اور مختلف زبان اور علوم وفنون کے ماہر بھی تھے۔ خوش آواز تھے اس لیے مقرر بھی اچھے تھے۔ اپنی حاضر جوابی اور حاضر دماغی سے وہ ہر محفل کو روشن کر دیتے تھے۔ وہ شگفتہ مزاج بھی تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ موقع شناس بھی تھے۔ اُن کی انہی خوبیوں کے سبب جمیل جالبی نے انھیں ''فنِ ندیمی میں یکتائے روزگار'' لکھا ہے۔ انشؔاء اپنی علمی صلاحیتوں سے باخبر تھے اور انہی کے ذریعے وہ بہت جلد بادشاہ، نوابین، امرا اور شہزادوں سے تعلقات پیدا کر لیتے تھے اور جس کے دربار سے وابستہ ہوتے تھے وہاں دوسرے شعرا کا چراغ گُل کر دیتے تھے۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں اپنا اردو دیوان مرتب کرنے والے انشؔاء کی درباروں سے وابستگی اُن کی اپنی ذہانت اور طبّاعی کی وجہ سے تھی۔ اُن کی پوری شخصیت پر درباداری کا اثر غالب ہے۔ یہی اثر اُن کی شاعری اور دیگر تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ انشؔاء کی زندگی معرکوں سے بھری ہوئی ہے۔ اُن کا پہلا معرکہ دلّی میں ہی ہوا تھا۔ اُس وقت دلّی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ صفِ اوّل کے شعرا لکھنؤ جا چکے تھے۔ حاتمؔ، سوداؔ اور دردؔ کے شاگردان نے محفلِ مشاعرہ کی شمع جلا رکھی تھی۔ اس زمانے میں ثناء اللہ فراقؔ، قدرت اللہ قاسمؔ، قمر الدین منّتؔ، ولی اللہ محبّؔ اور عظیم بیگ عظیمؔ کی بڑی شہرت تھی۔ انشؔاء ان سب سے کم عمر تھے مگر اپنی قادرالکلامی سے مقبول تھے لہٰذا سب کے سب ان سے کھنچے رہتے تھے۔ ایک محفل میں عظیمؔ نے غزل پڑھی جس میں کسی ایک شعر کا ایک مصرعہ بحرِ رجز میں اور دوسرا بحرِ رمل میں تھا، انشؔاء نے بھری محفل میں تقطیع کی فرمائش کی۔ عظیمؔ کو شرمندہ ہونا پڑا اور پھر ایک دوسرے کی ہجویں لکھی گئیں اور معرکہ کی ابتدا ہو گئی۔

انشاء کی صلاحیتوں کو اُس وقت جِلا ملی جب وہ دلّی سے لکھنؤ گئے اور پہلے شہزادہ سلیمان شکوہ کی ملازمت اور پھر نواب سعادت علی خاں کی مصاحبت اختیار کی۔ اُن کی سیرت وشخصیت اور کردار کی تشکیل میں لکھنؤ کے دربار نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ ظرافت انشؔاء کے مزاج کا خاصّہ تھی۔ انھیں اپنی بات کہنے اور منوانے کا ہنر آتا تھا اس لیے وہ اپنی ہر محفل میں توجہ کا مرکز بن جاتے تھے۔ اُن کی ہر محفل ہنسی مذاق سے آباد رہتی۔ نئے نئے خیالات کی اختراع میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ایسی صورت میں حاسدوں اور حریفوں کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ ایسے کئی موقعے آئے جہاں انہوں نے اپنے حریفوں کو زیر کیا۔ ایک مرتبہ انشاء اور مرزا جعفر میں لفظ ''ہجر'' کے تلفظ کو لے کر بحث ہو گئی۔ مرزا جعفر کا خیال تھا کہ اس کا تلفظ زیر (کسرہ) سے ہے اور انشاء کا کہنا تھا کہ زبر (فتحہ) سے ہے۔ پھر انشاء نے قرآن کے حوالے سے ثابت کر دیا کہ تلفظ زبر سے ہے۔ ایسے متعدد واقعات ہیں جن سے انشؔاء کی علمی فضیلت اور غیر معمولی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ انشاء کی انہی خوبیوں کے سبب نواب سعادت یار خاں رنگینؔ (۱۷۵۷ء–۱۸۳۵ء) ان کے بہت بڑے مدّاح تھے۔ رنگینؔ نے اپنی بیش تر تصانیف میں انشؔاء کا ذکر کیا ہے اور اُن کے علم وفضل اور زبان دانی کو سراہا ہے۔ انشؔاء نے بھی رنگینؔ کی تعریف کی ہے اور زبان دانی کے علاوہ دیگر صلاحیتوں کا ذکر ''دریائے لطافت'' میں کیا ہے اور یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے رنگینؔ سے بہت کچھ سیکھا ہے:

عجب رنگینیاں ہوتی تھیں تب باتوں میں اے انشؔاء
بہم مل بیٹھتے تھے جب سعادت یار خاں اور ہم

انشؔاء اور رنگینؔ مزاجاً ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ رنگینؔ کی صحبتوں کے فیض سے انشاء کے ہنر کو مزید جِلا ملی۔ انشاء کے یہاں جو ظرافت، چہل، بذلہ سنجی، انسان دوستی، ہنگامہ آرائی اور خودسری کی کیفیت

ہے وہ کچھ تو خداداد تھی اور کچھ سے زیادہ سعادت یار خاں رنگین کی صحبتوں کا نتیجہ تھی۔ انشاؔ کے مزاج کو جس چیز نے دوآتشہ بنایا تھا وہ اُن کی ذہنی خلّاقیت اور طبیعت کی درّاکی تھی۔ انشاء، وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے پہلے پہل اردو غزل اور قصیدہ میں انگریزی الفاظ داخل کیے مثلاً: Coach، Platoon، King، Cane، Bottle وغیرہ۔ انھوں نے بہت سے انگریزی الفاظ کے اردو ترجمے بھی کیے جیسے: Musical Box کے لیے صندوقِ فرنگی، Clock کے لیے ساعتِ فرنگی وغیرہ۔ یہی نہیں بلکہ سعادت یار خاں کے نام لکھے گئے قصیدہ کے ایک شعر کا ایک مصرعہ انگریزی میں اور دوسرا اردو میں لکھا:

اومِی لارڈ یو ٹو اور می پور سَلَیو
کنگ انگریز یہ بولے ہے ترا دیکھ چشم

(O Me Lord you to our me poor slave)

انشاؔ کی ذہنی خلاّقیت کو اُن کی درباداری نے بہت نقصان پہنچایا۔ دربار سے وابستگی کا ایک خراب نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی شاعری کی ساری متانت، ساری پاکیزگی اور علوِیٔ تخیل جاتی رہی اور مستقبل کی راہیں مسدود ہوتی چلی گئیں۔ خیالات میں نفاست کم ہوگئی اور مضامین بھی محدود ہوگئے۔ وہی شاعری جسے مقدس مشغلہ سمجھا جاتا تھا اور جو عرفانِ ذات کا پتہ دیتی تھی لکھنؤ کی خارجیت میں گم ہو کر بے وقار ہوگئی۔ درباداری سے ہونے والے نقصانات کا انھیں اندازہ تھا مگر وہ بے کس تھے۔ سعادت یار خاں نے ان سے کوئی بات کہی تو انھوں نے لکھا ہے:

''یہ بات سن کر میں خوب ہنسا اور کہا کیا خوب ارشاد ہوا اور میں بے تحاشا ہنسا ہر چند کہ اس میں ہنسی کی کوئی بات نہیں تھی۔''

(ترکی روزنامچہ، ص:۲۶)

اس قسم کی خوش گپیاں اور ہنسی مذاق درباری زندگی کی ضرورت تھی۔ انشاؔ کی صلاحیتوں کو زخم پہنچانے میں یہ چیز ضرورت سے زیادہ حائل رہی۔ دربار کی سازشوں نے بھی انھیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور وہ زندگی بھر اپنے معاصرین سے برسرِ پیکار رہے۔ عظیم کے بعد مصحفی، فائق، قتیل وغیرہ کے ساتھ معرکے رہے۔ مصحفی کے ساتھ ہونے والی معرکہ آرائی میں انسانی شرافت کی تمام حدیں پار ہوگئیں۔ اسلم پرویز نے لکھا ہے کہ:

''خواہ وہ کسی پیرِ صد سالہ کی معیت ہو یا کسی نوجوان کی صحبت، محرابِ کعبہ ہو یا درِ میکدہ، نواب کا دربار ہو یا فقیر کا تکیہ، مجلسِ شعر و سخن ہو یا میدانِ کارزار، انشاؔ کے مزاج اور طبیعت کا یہ مظاہرہ برمحل ہوتا وہاں انشاؔ کامیاب و کامگار اور جہاں بے محل ہو جاتا وہاں معتوب و خوار ہوتے، لیکن پھر بھی یہ ایک ابدی سلسلہ تھا۔ ایک چمنِ سدا بہار تھا جس نے سیکڑوں خزاؤں کے تھپیڑوں کو ٹھنڈا کر کے رکھ دیا۔ ایک جوئے رواں تھی جو زندگی کے ہر پیچیدہ موڑ پر سے سلامت روی کے ساتھ لہراتی ہوئی گزر گئی۔'' (انشاء اللہ خاں انشاؔ: عہد اور فن، ص:۱۰۵)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انشاؔ بلا کے ذہین تھے مگر انھیں اپنی ذہانت اور فطانت پر ضرورت سے زیادہ ہی یقین تھا۔ خود اعتمادی جب اپنی حد سے بڑھ جاتی ہے تو انسان کو مغالطے میں ہی نہیں بلکہ ذہنی آسیب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ انشاؔ کے مدِّ مقابل جو صف بندی ہوئی اس سے بھی انشاؔ آسیب میں مبتلا ہوئے اور ابھرنے والے خارجی جبر کو زیر کرنے کے لیے داخلی جبر میں گھِر گئے۔ اسی داخلی جبر کے سبب وہ نہ تو صورتِ حال کا صحیح صحیح تجزیہ کر سکے اور نہ خود اپنا صحیح طریقے سے احتساب کر پائے جس کے نتیجے میں اُن میں نفسیاتی گرہیں پڑتی چلی گئیں۔ دلّی سے لے کر لکھنؤ تک وہ حالتِ جنگ میں رہے۔ دوسروں کو زیر کرنے میں اُن کی خودسری نے کم اور درباری سیاست نے زیادہ نقصان پہنچایا۔ انشاؔ کی خودداری کو جس نے بھی للکارا، اُن میں احساسِ برتری اُتنا ہی بڑھتا گیا۔ اپنی انا کی تسکین کے لیے انھوں نے جواب دینا ہی بہتر سمجھا۔ یہ سچ ہے کہ ایسے موقعوں پر انشاؔ نے کبھی پہل نہیں کی، لیکن جب ایسا موقع آیا تو سینہ سپر ہوئے اور حدِّ ادب کی بھی تمیز باقی نہیں رکھی۔ اردو ادب میں ناانصافی کی ایسی دوسری مثال مشکل ہی سے ملے گی کہ مجرم کی جگہ ملزم ہی کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا ہو۔ انشاؔ کے خلاف دلّی سے لے کر لکھنؤ تک معاصرین نے سازشیں کیں اور انشاؔ نے جم کر جواب بھی دیا، لیکن سب کچھ کر گزرنے کے باوجود حالات انشاؔ کے خلاف ہی رہے۔

☆

انشاء اللہ خاں انشاؔ کی طبع رنگیں اُن کی شخصیت کا ایک ایسا جز تھی جو اُن کے دوسرے بہت سے کمالات پر ایک پردہ بن گئی۔ انھیں تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے خوش طبع، خوش نفس اور ہنسوڑ کے ساتھ سخن آگاہ جیسے لقب سے بھی نوازا تھا۔ اُن کی طبّاعی اور اختراع پسندی کو مختلف نام بھی دیے گئے۔ اِس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ اُس زمانے کے تہذیبی منظر نامے پر حاوی تھے اور ایسی صورت میں وہ اِس سے فرار بھی اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ حاکمانِ وقت کی خوشنودی حاصل کرنا، اُن کی صحبتوں کو گرم اور پُر جوش رکھنا، اُن کے مذاق و مزاج کے مطابق اپنی شعر گوئی کی سمت کا تعین کرنا تقریباً ہر دور کے شعرا کی مجبوری رہی ہے۔ جو بالآخر ایک معاشی مسئلہ تھا۔ لہٰذا انشاؔ نے بھی اپنی ذہانت، اپنی جودتِ طبع اور تیزیِ ادراک کو تمسخر اور ٹھٹھول پر قربان کر دیا۔ قدرت نے جو بیش بہا صلاحیت عطا کی

تھی، وہ نہ تو جرأت کے حصے میں آئی تھی اور نہ ہی مصحفی کے، گو کہ مصحفی غزل میں اُن سے بڑے تھے، لیکن مصحفی نے غزل میں کسی طرح کی جرأت آزمائی کا ثبوت نہیں دیا۔ اُن کے اسلوبِ غزل کو ہم امتزاجی اسلوب کہہ سکتے ہیں، جس میں اُن کے معاصرین اور ماضیِ قریب کے بزرگوں کی آوازوں کی گونج واضح نظر آتی ہے۔ احتشام حسین نے بھی مصحفی کو کسی ایک رنگ کا شاعر کہنے کے بجائے یہ کہا ہے کہ ''میر، سودا، جرأت اور انشاء، سبھی کے رنگ اُن کے یہاں ملتے ہیں۔'' لیکن انشاء کے یہاں جو طبّاعی اور زبان پر گہری گرفت نظر آتی ہے، اُس میں صنّاعی اور دماغ پاشی کے ساتھ ساتھ خلاّقی بھی ملتی ہے۔

انشاء کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ نیا خلق کرنے جستجو میں سرگرداں رہتے تھے۔ وہ اپنے وقت کے تابع بھی تھے اور اپنے وقت سے آگے بھی۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ بیک وقت کئی مقاصد لے کر چلتے تھے۔ کسی ایک مقصد کا تعین وہ زندگی بھر نہیں کر سکے۔ وقتی ضرورتوں کے مارے ہوئے بھی تھے اور منہ پھٹ بھی۔ دونوں چیزوں نے انھیں گھر کا رکھا نہ گھاٹ کا۔ اُن کے بیشتر اوقات دربارداری کے تقاضوں کو پورا کرنے میں صَرف ہوئے۔ سعادت علی خاں نے انھیں سر پر بٹھایا اور ایک گستاخانہ جواب پر اپنے دربار سے نکال باہر بھی کیا۔ انشاء جیسے ماہرِ فن اور ماہر لسان نے اپنی مہارتوں کا استعمال لطیفہ گوئی، بدیہہ گوئی، معرکہ آرائی، بحث ومباحثے، دوسروں کو نیچا دکھانے میں کیا۔ ہجو ہو کہ ریختی ہر میدان کو سر کرنے میں انھیں زیادہ دلچسپی تھی۔ اسی سے انھیں ذہنی و جذباتی تسکین بھی ملتی تھی۔ ہم بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ انشاء نے ہنسی ٹھٹھول اور معرکہ آرائیوں میں اتنا وقت صرف نہیں کیا ہوتا تو 'دریائے لطافت' یا 'رانی کیتکی' کے علاوہ بھی اُن کے سامنے اُن کے علم وفن کے مظاہرے کے لیے ایک وسیع میدان کھلا ہوا تھا۔ وہ اپنے معاصرین میں واحد شخص تھے جو بیک وقت کئی زبانوں سے واقف تھے اور اپنی شاعری میں انھوں نے نڈر ہو کر ان کا استعمال بھی کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میر کے یہاں نامانوس الفاظ کی فراوانی ہے، لیکن اس سلسلے میں میر بھی کوتاہ پڑ جاتے ہیں۔ میر نے بھی ایسے بہت سے الفاظ کو بڑی بے تکلفی اور بے باکی کے ساتھ اپنی غزل میں جگہ دی ہے جنھیں عرفِ عام میں صوتی اعتبار سے کرخت اور کڈھب کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے انشاء کو یہ ترغیب میر ہی سے ملی ہو۔ انشاء اس طرح کے عمل میں میر سے بازی لے گئے ہیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، ہجو، ریختی، گویا ہر صنف میں انہوں نے فیّاضی کے ساتھ ایسے الفاظ کا استعمال کیا۔ اِسے اُن کی جرأت مندی کہی جائے یا تجربہ پسندی یا محض دوسرے معاصرین کو اپنی لسانی چابک دستی سے مرعوب کرنے کی روش یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جرأت اور مصحفی کی جذباتی صاف ستھری اور خوش آہنگ غزل سے انحراف کا رویّہ۔ جمیل جالبی نے لکھا ہے:

> ''اردو غزل اور قصیدہ ہی وہ اصنافِ سخن ہیں جن میں انشاء نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں، لیکن مقدارِ کلام کے لحاظ سے اُن کی غزلیں مصحفی اور جرأت سے بہت کم ہیں۔ جرأت کے دیوان میں گیارہ سو سے زیادہ غزلیں شامل ہیں اور صرف ردیف ''ی'' میں تقریباً چار سو تینتیس (۴۳۳) غزلیں ہیں جبکہ انشاء کی کُل اردو غزلیں کم وبیش چار سو ساٹھ (۴۶۰) ہیں۔''

(تاریخ ادبِ اردو، ص: ۱۲۸، جلد: سوم)

ان میں بھی مشکل اور سنگلاخ زمینوں والی غزلوں کے علاوہ ایک ہی بحر اور زمین میں غزل در غزل والی لمبی لمبی غزلوں کی بھی خاصی تعداد ہے۔ اس طرح کی غزلوں میں کہیں کسی جذبے کی چمک اور ذات کے تجربے کے رنگ سے ہمیں سابقہ نہیں پڑتا۔ انشاء کو دماغی کمالات دکھانے کا ایک عارضہ سا ہو گیا تھا۔ کچھ تو درباروں میں اپنی دھاک جمانا اُن کو مقصود تھا اور معاشرے میں اسے ہی قادرالکلامی سے منسوب بھی کیا جاتا تھا۔

انشاء، دہلوی رنگ والی غزلوں میں ہی اپنی اصل جذباتی شخصیت سے اپنا تعارف کراتے ہیں، جبکہ ان کا بیشتر کلام غیر جذباتی اور صنّاعی کا ایک ایسا نمونہ ہے جس نے اُن کی شخصیت کی آزادانہ نشوونما پر ہی روک لگا دی۔ اب ذرا اُن اشعار پر غور کریں جن میں انہوں نے کسی دوسری زبان یا بولی کا لفظ استعمال کر کے غالباً یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور جو پورے دو سو برس پہلے کی تھی کہ غزل کو مخصوص الفاظ اور مخصوص استعاروں تک محدود کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم اسے آزادی کے ساتھ اپنے طور پر پھلنے پھولنے کا موقع ہی نہیں دینا چاہتے۔ انشاء نے یہ بھی ثابت کیا کہ غزل کا دامن وسیع ہے اور صنفِ سخن کے اعتبار سے وہ اتنی بے لچک بھی نہیں ہے جتنا اسے سمجھا جاتا رہا ہے۔ اسی طرح قصیدہ میں بھی انھوں نے عرفِ عام میں فصیح و بلیغ الفاظ کے ساتھ غیر فصیح اور کرخت یا ہکاری الفاظ کا استعمال بڑی آزادی کے ساتھ کیا ہے۔ وہ ڈرامائی صورت حال بھی پیدا کرتے ہیں، حرکت وعمل سے پیدا ہونے والی آوازوں سے سمعی پیکر بھی بناتے ہیں۔ ہم اس طرح کے اشعار محض پڑھتے ہی نہیں ہیں بلکہ اُن کیفیات کو چشمِ تصوّر سے دیکھتے بھی ہیں:

مجھے چھیڑنے کو ساقی نے دیا جو جام اُلٹا
تو کیا بہک کے میں نے بھی اسے سلام اُلٹا

درِ میکدہ سے آئی مہک ایسی بے مزے کی
کہ پچھاڑ کھا گرا واں دلِ تشنہ کام اُلٹا

کچھ یہ مجھی کو یوں نہیں اُس کی پھبن نے غش کیا
غنچے بھی چٹ سے فق ہوئے سارے چمن نے غش کیا

دیوار پھاند نے میں دیکھو گے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا

لے کے میں اوڑھوں، بچھاؤں یا لپیٹوں کیا کروں
روکھی پھیکی ایسی سوکھی مہربانی آپ کی

انشاؔ نے آخری شعر میں اس معنیٰ میں کمال کر دکھایا ہے کہ مہربانی ایک فعل ہے، ایک ایسا عمل جس کا تعلق کر کے دکھانے سے ہے۔ اسے ہم ایک انسانی توفیق بھی کہہ سکتے ہیں۔ انشاؔ نے کمالِ ہنرمندی سے اسے ایک ٹھوس چیز میں بدل دیا ہے۔ یہاں فراقؔ کا شعر یاد آتا ہے:

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تجھے رنجشِ بے جا بھی نہیں

فراقؔ نے 'مہربانی' کو رحم کے معنیٰ میں استعمال کیا ہے جو اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ شعر میں منتقل ہو کر کس طرح ایک لفظ کے لغوی معنی اپنی ایک نئی تعبیر مہیّا کرتے ہیں۔ انشاؔ مہربانی کو صرف روکھی پھیکی کی حد تک رکھتے تو یہ ایک عمومی اور امکانی بات ہوتی، لیکن اسے اوڑھنے بچھانے اور لپیٹنے کے اعمال سے وابستہ کر کے یہ واضح کیا ہے کہ دیکھو شاعری قواعد کو یوں ردّ کرتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ شاعری کی اپنی قواعد ہوتی ہے۔

انشاؔ کی غزلوں میں سٹاسٹ، جھٹ پٹ، غٹا غٹ، چٹ چٹ، بوچھاڑ، پھوڑا، نگوڑا، واچھڑے جیسے ہکاری الفاظ کی ہی بھرمار نہیں ہے بلکہ ریختی کا رنگ اُن کی غزلوں اور قصیدوں میں بھی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یہاں قصیدہ کے بھی دو چار اشعار پیش کرتا ہوں جو دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ یہ قصیدہ شہزادہ سلیمان شکوہ کی مدح میں لکھا گیا ہے اور سراپا نگاری کی یہ ایک نادر مثال ہے:

صبح دم میں نے جولی، بسترِ گُل پر کروٹ
جنبشِ بادِ بہاری سے گئی نیند اُچٹ
پائے خُم جیسے یہ مست پڑا ہووے کوئی
گوشۂ چشم میں یوں خال رہا تھا وہ لپٹ
تھا وہاں نامِ خدا عالمِ خود بینی گرم
اُس کے نتھنوں کی پھڑک میں بھی تھی غضب گرماہٹ

ان اشعار میں انشاؔ نے بصری حس کا بڑی خوبصورتی اور نزاکت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ بسترِ گل پر کروٹ، پائے خم، جیسے مست پڑا ہو کوئی، گوشۂ چشم میں خال کا لپٹنا، نتھنوں کی پھڑک وغیرہ میں حسِّ باصرہ ہی کام نہیں کر رہی ہے، بلکہ سمعی پیکر بھی خلق ہو رہے ہیں۔ اسی طرح درج ذیل اشعار میں چشمِ تر پر قدم رکھنے، آبشار پر عکسِ شگوفہ کے پڑھنے وغیرہ میں بھی حسِ باصرہ کی کارفرمائی محسوس کی جا سکتی ہے۔ انشاؔ کے درج ذیل اشعار میں جذبے کی شدت اور جذبے کی چمک کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان میں محسوسات کی ایک دنیا آباد ہے۔ انشاؔ نے ان اشعار میں اُن داخلی کیفیتوں کو سمونے کی کوشش کی ہے جن سے عموماً وہ فرار اختیار کرتے رہے ہیں:

بستی تجھ بن اُجاڑ سی ہے
کم بخت یہ شب پہاڑ سی ہے
ساتھ اپنے کوئی اربابِ سفر لیتا ہے
تو فقیر اُس گھڑی سر زانو پہ دھر لیتا ہے
خوابِ عدم سے شورِ جنوں نے جگا دیا
انشاء بس اور نیند کہاں، خوب سو چکے
زمیں سے اُٹھی ہے یا چرخ پر سے اُتری ہے
یہ آگ عشق کی یارب کدھر سے اُتری ہے

میرا خیال ہے کہ انشاؔ کی غزلوں، قصیدوں، ریختی وغیرہ میں مستعمل الفاظ کی اگر ایک فرہنگ ترتیب دی جائے تو یہ چیز اور واضح اور مستند طور پر سامنے آجائے گی کہ انشاؔ نے سودا، میر، انیس و دبیر اور جوشؔ سے بھی زیادہ ذخیرۂ الفاظ استعمال کیا ہے اور عرفِ عام میں ہم جن الفاظ کو غیر شاعرانہ کہتے ہیں اور صوتی اعتبار سے کرخت ہونے کے باعث شعر میں برتنے کے لائق نہیں سمجھتے، انشاؔ نے انھیں بھرتی کے طور پر نہیں شعری ضرورت کے طور پر برتا ہے۔ اس طرح کے الفاظ کو غیر فصیح بھی کہا جاتا ہے، لیکن ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں، فصیح اور غیر فصیح الفاظ کی تخصیص کا تصور ہی بدل گیا ہے۔ اب ہر لفظ کی شعری قدر اُس کے شعری سیاق، استعمال کے طریقے اور شعر میں اُس کی مناسبت سے طے کی جاتی ہے۔ شاعری میں تجربہ پسندی کا سلسلہ گزشتہ صدی سے جاری ہے اور ماضی میں اِس سلسلے کو ہم کسی ایک شاعر سے ربط دے سکتے ہیں تو وہ ہیں صرف اور صرف انشاء اللہ خاں انشاء۔ اسی معنیٰ میں انشاء کو میں ایک تجربہ پسند شاعر سمجھتا ہوں۔ ◆◆◆